آداب المعلمین

مولانا ذوالفقار احمد نقشبندی

(۱)......استاد کو چاہیے کہ علم سکھانے میں اجرت کا خواہاں نہ ہو، محض اللہ تعالیٰ کی رضا جوئی کے لیے یہ کام کرے اور بزبان حال یوں کہے: ﴿یقوم لا أسئلکم علیه أجرا﴾ (اے میری قوم میں آپ سے اس پر بدلہ نہیں چاہتا، میرا بدلہ تو اللہ کے ذمے ہے)۔ لوگوں کی جیب پر نظر رکھنے کے بجائے اللہ تعالیٰ کی ذات اور اس کے خزانوں پر نظر رکھے۔ یاد رکھیں! اللہ تعالیٰ علماء کو وہیں سے رزق دیتا ہے جہاں سے انبیاء کو رزق دیا کرتا تھا۔ محض دنیا کے راحت وآرام کی خاطر اور تنخواہ کی کمی یا زیادتی کی وجہ سے ایک درس گاہ کو چھوڑ کر دوسری میں نہ جانا چاہیے۔ اس کو معمولی نہ سمجھیں کہ یہی تو علم کو دنیا طلبی کا ذریعہ بنانا ہے، نبی اکرم ﷺ کا ارشاد ہے: "من تعلم علما مما یبتغی به وجه الله لا یتعلمه إلا لیطلب عرضا من الدنیا لم یجد عرف الجنة ریحها" (سنن ابو داؤد، و ابن ماجه) یعنی جس نے ایسا علم سیکھا جس سے اللہ تعالیٰ کی رضامندی حاصل کی جاسکتی ہے لیکن اس کا مقصد دنیا ہے تو ایسے شخص کو جنت کی ہوا بھی نہ لگے گی۔

یحییٰ بن معاذؒ فرماتے تھے کہ علم وحکمت سے جب دنیا طلب کی جائے تو ان کی رونق چلی جاتی ہے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا قول ہے کہ جس عالم کو دنیا سے محبت رکھنے والا دیکھو، اس کو دین میں متہم سمجھو اس لیے کہ جس کو جس سے محبت ہوتی ہے اسی میں گھسا کرتا ہے۔

بئس المطاعم حین الذل تکسبها　　　　القدر منتصب والقدر مخفوض

وہ کھانے کس قدر بُرے ہیں جن کو تو ذلت کے ساتھ حاصل کر رہا ہے کہ ہانڈی تو چولہے پر چڑھی ہے اور عزت خاک میں مل رہی ہے۔

خطیب نے کفایہ میں نقل کیا ہے کہ مشہور حافظ حدیث حماد بن سلمہؒ کا ایک شاگرد "کافی" تھا۔ اس نے ایک مرتبہ

آپ کو کافی چیزیں بطور عطیہ پیش کیں۔ حضرت حمادؒ نے فرمایا: دو باتوں میں سے ایک کو قبول کرلو۔ چاہو تو آپ کے یہ تحائف قبول کرلو مگر آج کے بعد تمہیں حدیث نہیں پڑھاؤں گا اور اگر چاہتے ہو کہ تمہیں حدیث پڑھاؤں تو یہ ہدیہ قبول نہ کروں گا۔ (کفایہ: ص 153)

ابوعبدالرحمٰن سلمیؒ کی خدمت میں عمر بن حریث نے کچھ اونٹ بطور ہدیہ پیش کیے، انہوں نے یہ کہہ کر واپس کردیے کہ کہ ہم نے تمہارے لڑکے کو قرآن پڑھایا ہے، کتاب اللہ پر اجرت لینا مناسب نہیں ہے۔ (طبقات ابن سعد) حدیث کے مشہور راوی زکریا عدیؒ کے متعلق لکھا ہے کہ ایک دفعہ ان کی آنکھ دکھنے لگی، ایک شخص سرمہ لے کر حاضر ہوا۔ پوچھا: کیا تم مجھ سے حدیث پڑھتے ہو؟ اس نے کہا: جی ہاں! فرمایا: یہ کیسے ہوسکتا ہے کہ حدیث پڑھانے پر اجرت لوں۔

ایک مرتبہ مولانا مرتضٰی حسنؒ نے حکیم الامتؒ سے عرض کیا کہ حضرت! تنخواہ لینے میں میری طبیعت کو الجھن ہوتی ہے ، یہ تو صاف دین فروشی ہے۔ حکیم الامتؒ نے جواب دیا: تنخواہ لینی چاہیے، اس سے طبیعت پر بوجھ رہے گا کہ کام اچھی طرح کرنا چاہیے۔ مولانا نے عرض کیا کہ یہ تو مصلحت ہوئی مگر اس ضرر کا کیا علاج ہے کہ اس میں دین فروشی ہے۔ حکیم الامتؒ نے جواب دیا کہ تنخواہ میں دین فروشی ہے یا نہیں اس کی بہترین پہچان یہ ہے کہ اگر کسی جگہ گزارہ کی تنخواہ ملتی رہے مگر دوسری جانب زیادہ کی صورت نظر آئی، مگر دینی خدمت کا موقع زیادہ نہ ہو تو اب اگر پہلی جگہ کو چھوڑ کر دوسری جگہ جائے تو دین فروشی ہوگی۔

حضرت مولانا ادریس کاندھلویؒ ریاست بہاول پور میں بہت زیادہ مشاہرہ پر کام کررہے تھے۔ حضرت مفتی محمد حسن صاحبؒ (بانی جامعہ اشرفیہ لاہور) نے خط لکھا کہ حضرت! آپ تو امیروں کی بریانی کھاتے رہتے ہیں، ہم فقیروں کی دال قبول فرمائیں۔ حضرت کاندھلویؒ نے بغیر تفصیل معلوم کیے وہاں سے استعفیٰ پیش کیا اور بقیہ زندگی جامعہ اشرفیہ میں دینی خدمت کرتے کرتے گزاردی۔

ریاست بہاولپور میں جب جامعہ اسلامیہ کی بنیاد رکھی گئی تو نواب صاحب نے علمائے کرام سے پوچھا کہ اس مدرسے کی آبادی کی کیا صورت ہوگی۔ انہوں نے جواب دیا کہ ہم آپ کو ایک عالم باعمل کا نام بتادیں گے آپ انہیں کام کے لیے یہاں لے آنا تو مدرسہ خود بخود آباد ہوجائے گا۔ نواب صاحب نے کہا: ٹھیک ہے، ہیرا آپ چنیں قیمت میں لگادوں گا۔ جب عمارت مکمل ہوگئی تو نواب صاحب نے پوچھا کہ کس عالم کو یہاں کا انتظام و انصرام سپرد کرنا ہے۔ علمائے کرام نے حضرت مولانا قاسم نانوتویؒ کا نام پیش کیا۔ نواب صاحب نے پوچھا: دیوبند میں کیا مشاہرہ لے رہے ہوں گے؟ جواب ملا دو یا تین روپے ماہانہ۔ نواب صاحب نے کہا: آپ وفد کی صورت میں جاکر انہیں دعوت دیں اور بتائیں کہ انہیں یہاں تعلیم و تدریس کی ہر آسانی ہوگی، مزید برآں کہ انہیں سو روپے مشاہرہ بھی پیش کیا جائے گا۔ علمائے کرام نواب صاحب کی فراخدلی پر بہت خوش ہوئے اور حضرت نانوتویؒ کی خدمت میں جامعہ اسلامیہ بہاول پور کی خصوصیات نہایت شرح وبسط

کے ساتھ بیان کیں، نواب صاحب کی دین دارانہ اور فیاضانہ طبیعت کا نقشہ بھی خوب کھینچا اور یہ بھی بتایا کہ وہاں جانے کی صور میں آپ کو سو روپے مشاہرہ عطا کیا جائے گا۔ حضرت نانوتویؒ نے یہ سن کر جواب دیا کہ یہاں میرا مشاہرہ تین روپے ہے، دو روپے میرے گھر کا خرچہ ہے اور ایک روپیہ میں فقراء اور مساکین میں تقسیم کر دیتا ہوں، اگر میں بہاول پور چلا گیا اور مجھے ماہانہ سو روپے ملے تو دو روپیہ تو میرے گھر کا خرچہ ہوں گے اور بقیہ اٹھانوے (۹۸) روپے مستحق لوگوں میں تقسیم کرنے کے لیے سارا دن اسی کام میں مشغول رہنا پڑے گا، میں پھر تعلیم و تدریس کیسے کروں گا؟! علمائے کرام یہ جواب سن کر لاجواب ہو گئے۔

دین کی محنت کرنے والے حضرات جس قدر استغناء سے کام کریں گے اسی قدر دینی محنت کے گہرے اثرات مرتب ہوں گے، انہیں چاہیے کہ امراء کو استغناء کی چھری سے ذبح کریں۔ دنیا سے جتنی بے رغبتی ہوگی دین کی شان و شوکت اتنی زیادہ ہوگی۔ سلفِ صالحین تو ایسے شاگرد سے ہدیہ بھی قبول نہیں کرتے تھے جس پر دین کا رنگ نہ چڑھا ہو یا جو احسان جتا کر ہدیہ دے۔ حضرت نانوتویؒ کی خدمت میں ایک آدمی نے ہدیہ پیش کیا آپ نے معذرت کر دی، اس نے بہت اصرار کیا لیکن حضرت نانوتویؒ بھی انکار کرتے رہے۔ جب اس نے دیکھا کہ کوئی تدبیر کارگر نہیں ہوتی تو واپس گھر جانے لگا۔ مسجد سے باہر نکلنے لگا تو اس کی نظر حضرت کے جوتوں پر پڑی، اس نے وہ تمام رقم حضرت کے جوتوں میں چھپا دی، دل میں یہ خیال تھا کہ جب حضرت گھر جانے کے لیے جوتے پہنیں گے تو رقم کو خواہ مخواہ قبول کرنا پڑے گا۔ جب حضرت مسجد سے باہر نکلے اور رقم جوتے میں پڑی دیکھی تو حضرت مسکرائے اور فرمایا: جو آدمی دنیا کو دور دھکیلتا ہے دنیا اس کے جوتوں میں ذلیل و خوار ہو کر آتی ہے، پہلے یہ بات کتابوں میں پڑھتے تھے آج الحمد للہ آنکھوں سے دیکھ لی۔

حضرت تھانویؒ سے ایک شخص نے بیعت کی جو حکومت کے کسی بڑے عہدے پر تعینات تھا، کچھ عرصہ بعد اس نے ایک لاکھ روپیہ بذریعہ منی آرڈر بھیجا۔ حضرت تھانویؒ نے واپس بھیج دیا۔ ان صاحب کو ہرگز یہ توقع نہ تھی۔ انہوں نے خط لکھا کہ میں نے ایک لاکھ ہدیہ منی آرڈر کے ذریعے بھیجے جو آپ نے واپس کر دیے، آپ کو مجھ جیسا مرید نہ ملے گا۔ حضرتؒ نے جواب میں لکھا کہ میں نے پیسے واپس بھیج دیے، آپ کو بھی مجھ جیسا کوئی پیر نہ ملے گا جو ایک لاکھ روپے کو ٹھوکر مار دے۔ انہی سلفِ صالحین کی شان تھی کہ دنیا ذلیل ہو کر ان کے قدموں میں جگہ ڈھونڈتی تھی۔ ” أَتَتْهُمُ الدُّنْيَا وَهِيَ رَاغِمَةٌ “ یعنی دنیا ان کے پاس ذلیل و خوار ہو کر آتی تھی۔ تعلیم و تدریس اور دعوت و تبلیغ کا کام کرنے والے اگر اپنے دلوں میں دنیا کی بے وقعتی پیدا کر لیں اور استغناء کے ساتھ دین کا کام کریں تو آج بھی اس کے نظارے اپنی آنکھوں سے دیکھ سکتے ہیں۔

(۲)...... استاذ کو چاہیے کہ شاگردوں پر شفقت کرے اور ان کو اپنے بیٹوں کے برابر جانے۔ نبی اکرم ﷺ نے ارشاد فرمایا: "إنما أنا لكم مثل الوالد لولده " یعنی میں تمہارے لیے ایسا ہوں جیسا والد اپنے لڑکے کے لیے۔ حضرت

سعید خدری رضی اللہ عنہ کی خدمت میں جب طلبہ حاضر ہوتے تو آپ فرماتے سنو! رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: ”عن قریب تمہارے لیے زمین مسخر کردی جائے گی اور تمہارے پاس کم عمر آئیں گے جو علم کے بھوکے پیاسے ہوں گے، تفقہ في الدین کے خواہش مند ہوں گے، تم سے دین سیکھنا چاہیں گے، پس جب وہ آئیں تو انہیں تعلیم دینا، مہربانی سے پیش آنا، ان کی آؤ بھگت کرنا اور انہیں حدیث بتانا“۔ (جامع بیان العلم)

امام ابو یوسفؒ کا قول ہے کہ اپنے شاگردوں کے ساتھ ایسے خلوص اور محبت ے ساتھ پیش آؤ کہ دوسرا دیکھے تو یہ سمجھے کہ یہ تمہاری اولاد ہے۔ ایک عالم دین کے بیٹے نے ان کے کسی شاگرد کے ساتھ بدتمیزی کی تو انہوں نے غصے میں آکر فرمایا: ”دیکھو! یہ میرے سینے کی اولاد ہے جب کہ تم میرے پیشاب کی اولاد ہو“۔

حضرت گنگوہیؒ طلبہ سے بہت محبت والفت سے پیش آتے۔ ایک دفعہ مسجد کے صحن میں بیٹھے درس دے رہے تھے کہ اچانک زوردار بارش شروع ہوگئی، طلبہ اپنی اپنی کتابوں کو پانی میں بھیگنے سے بچانے کے لیے جوتے وہیں چھوڑ کر کمروں کی طرف بھاگ گئے، حضرت گنگوہیؒ نے اپنا رومال بچھایا اور تمام جوتوں کو اس میں رکھ کر گٹھڑی باندھی اور سر پر اٹھا کر اندر لے آئے، طلبہ نے دیکھا تو ان کی چیخیں نکل گئیں کہ حضرت ہم خود ہی جوتے اٹھا لیتے آپ نے کیوں ایسا کیا؟ حضرت نے جواب دیا: جو لوگ قال اللہ اور قال الرسول پڑھتے ہوں رشید احمد ان کے جوتے نہ اٹھائے تو اور کیا کرے۔

استاذ الکل مولانا مملوک علیؒ کا یہ حال تھا کہ جب کوئی طالب علم بیمار ہوتا اس کی قیام گاہ پر جا کر اس کی عیادت کرتے اور مختلف طریقوں سے اس کی دل جوئی کرتے۔ اس زمانے میں دار الاقامہ نہیں بنا تھا، طلبہ مختلف مساجد اور مکانوں میں رہتے تھے۔

(۳)...... استاذ کو چاہیے کہ غصہ اور طیش میں آکر بچوں کو سزا نہ دے، یہ حماقت ہے کہ آدمی جس برتن میں کچھ ڈالنا چاہے اسی میں سوراخ کردے۔ جب شاگرد کے دل کو مار پیٹ سے چھلنی کردے گا تو اس میں خیر کی بات کیسے ڈالے گا۔ خوف دلانے اور دباؤ ڈالنے سے وقتی طور پر کام چل جاتا ہے مگر اس کے اثرات عارضی ہوتے ہیں۔ یہ اصول کی بات ہے کہ وہی استاذ شاگرد پر ہاتھ اٹھاتا ہے جو اپنی شکست تسلیم کرلے کہ میں زبان سے سمجھانے سے قاصر ہوں۔ چھوٹے بچوں کے دل میں رعب اور خوف کا سمانا ایسا ہی بُرا ہے جیسا کہ نرم ونازک پودے کو سخت گرمی کی تپش لگنا۔

امام غزالیؒ فرمایا کرتے تھے کہ استاذ کو بردبار اور حلیم الطبع ہونا چاہیے۔ اللہ رب العزت قرآن مجید میں ارشاد فرماتے ہیں: ﴿ ولو کنت غلیظ القلب لانفضوا من حولك ﴾ (اگر آپ سخت گیر سنگدل ہوتے تو یہ آپ کے گرد سے بھاگ جاتے) جب اللہ تعالیٰ اپنے محبوب ﷺ کے بارے میں یہ فرماتے ہیں تو پھر ہم کس کھیت کی گاجر مولی ہیں۔

حضرت شیخ عبد القادر جیلانیؒ نے فرمایا: جب تک تیرا غصہ باقی ہے اپنے آپ کو اہل علم میں شمار مت کر۔ جس طرح مریض کڑوی دوا پینے سے گریز کرتا ہے اسی طرح شاگرد تند خواہ استاذ سے علم حاصل کرنے میں تنگی محسوس کرتا ہے۔ ”تعلیم

المتعلم‘‘ میں لکھا ہے کہ مشفق استاذ کا لڑکا بھی عالم ہوتا ہے، چونکہ استاذ کی کوشش ہوتی ہے اس کے شاگرد عالم بن جائیں اسی آرزو کی برکت سے اور اس کی شفقت سے اس کا لڑکا عالم بن جاتا ہے۔ امام ربانی مجدد الف ثانیؒ کے حالات میں لکھا ہے کہ ایک طالب علم فراش (بچھونے) پر بیٹھا قرآن پڑھ رہا تھا۔ حضرت نے خیال کیا تو اپنے نیچے زیادہ پایا، فی الفور زائد فراش اپنے نیچے سے نکال کر اس طالب علم کے نیچے بچھا دیا۔ استاذ کو چاہیے کہ شاگردوں کے ساتھ نرم خوئی کا معاملہ کرے۔

(۴)......استاذ کو چاہیے کہ طلبہ کی خیر خواہی میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہ کرے۔ چند باتیں غور طلب ہیں:

اگر طالب علم اپنے اخراجات برداشت نہ کر سکتا ہو تو استاذ اس کا حتی الوسع بندوبست کرے۔ حضرت امام ابو حنیفہؒ کے حالات زندگی میں لکھا ہے کہ امام ابو یوسفؒ کی والدہ نے کسب معاش کے لیے بھیجا، یہ حصولِ رزق کے لیے مختلف کام کرتے رہے۔ والدہ کا مشورہ یہ تھا کہ کپڑے دھونے کا فن سیکھ لیں تو کچھ گذر اوقات کا بندوبست ہو جائے گا۔ ایک مرتبہ امام ابو یوسفؒ، امام ابو حنیفہؒ کے درس میں شریک ہوئے تو انہیں علم حاصل کرنے کا شوق پیدا ہوا۔ والدہ کی طرف سے اصرار تھا کہ محنت مزدوری کر کے پیسہ کمائیں اور ان کا جی چاہتا تھا کہ علم حاصل کر کے عالم بنوں، انہوں نے سارا حال امام ابو حنیفہؒ کے گوش گزار کر دیا۔ امام صاحبؒ نے شاگرد رشید میں سعادت کے آثار دیکھے تو فرمایا: درس میں باقاعدگی سے آتے رہیں، ہم آپ کو کچھ ماہانہ وظیفہ دے دیا کریں گے، وہ آپ اپنی والدہ کو دے دیا کریں۔ چنانچہ امام ابو یوسفؒ سارا مہینہ امام صاحب کی مجلس درس میں شریک رہتے اور امام صاحب اپنی گرہ سے کچھ وظیفے کے طور پر پیسے دیتے جو امام ابو یوسفؒ اپنی والدہ کے سپرد کر دیتے۔ کافی عرصہ تک یہ سلسلہ اسی طرح چلتا رہا، ایک دن امام ابو یوسفؒ کی والدہ کو پتہ چلا کہ بیٹا محنت مزدوری کے بجائے تحصیل علم میں مشغول ہے تو وہ ناراض ہوئیں اور بیٹے کو سمجھایا کہ تمہارے والد فوت ہو گئے ہیں، گھر میں کوئی دوسرا مرد نہیں جو کما سکے، لہٰذا تم کوئی کام کرتے تو اچھا ہوتا، بہتر تھا کہ کوئی فن سیکھ لیتے۔ امام ابو یوسف نے یہ سارا ماجرا امام صاحب کی خدمت میں پیش کر دیا۔ امام صاحبؒ نے کہا کہ اپنی والدہ سے کہو کسی وقت آ کر میری بات سنیں، چنانچہ امام ابو یوسفؒ اپنی والدہ کو لے کر حاضر خدمت ہوئے۔ والدہ نے امام صاحب کی خدمت میں ساری صورتِ حال پیش کی جو آپ پہلے سن چکے تھے۔ آپؒ نے ارشاد فرمایا کہ میں آپ کے بیٹے کو ایسا فن سکھا رہا ہوں کہ جس سے یہ پستے کا بنا ہوا فالودہ کھایا کرے گا۔ امام ابو یوسفؒ کی والدہ یہ سمجھیں کہ شاید امام صاحب خوش طبعی فرما رہے ہیں، تاہم وہ خاموش ہو گئی کہ گھر کا خرچہ تو وظیفے سے چل رہا تھا۔ جب امام ابو یوسفؒ نے تکمیل علم سے فراغت حاصل کر لی اور ابو یوسف امام بن گئے تو ان کے علم کا شہرہ دور دور تک پھیل گیا۔ حکومتِ وقت نے امام ابو حنیفہؒ کو قاضی القضاۃ کا عہدہ پیش کیا تو انہوں نے علمی مشغولیت کی وجہ سے معذرت کر دی، البتہ امام ابو یوسف کو فرمایا کہ وہ یہ عہدہ قبول کر لیں، امام ابو یوسفؒ وقت کے چیف جسٹس (قاضی القضاۃ) بن گئے۔ پورے ملک میں ان کی قبولیت عام ہو گئی، حکومتِ وقت

نے یہ ذمہ لیا کہ کام کے دوران کھانے کا بندوبست حکومت کی طرف سے ہوگا۔ایک مرتبہ خلیفۂ وقت ان کو ملنے کے لیے آیا اور اپنے ہمراہ پیالے میں فالودہ لایا، جب امام ابو یوسفؒ کو پیش کیا تو کہا: حضرت! یہ قبول فرمائیں، یہ وہ نعمت ہے جو ہمیں کبھی کبھی ملتی ہے مگر آپ کو روزانہ ملا کرے گی۔آپؒ نے پوچھا: یہ کیا ہے؟ خلیفہ نے کہا: یہ پستے کا بنا ہوا فالودہ ہے۔ امام ابو یوسفؒ حیران ہوئے کہ استاذ مکرم کی زبان سے نکلی ہوئی بات من وعن پوری ہوئی۔

محمد بن عیسیٰؒ کا بیان ہے کہ ایک مرتبہ عبداللہ بن مبارکؒ نے طرسوس سے شام کا سفر کیا تو راستے میں رقہ کی سرائے میں قیام فرمایا۔وہاں آپ کی ایک نوجوان سے ہوئی جس کی نیکی اور پرہیزگاری آپ کو پسند آئی۔چنانچہ آپ نے معمول بنالیا کہ جب اس سرائے میں قیام پذیر ہوتے تو اس نوجوان سے ملاقات کرتے،ایک مرتبہ آپ رقہ میں قیام پذیر ہوئے تو نوجوان کو غیر حاضر پایا۔جب لوگوں سے پوچھ گچھ کی تو پتہ چلا کہ وہ کسی وجہ سے دس ہزار درہم کا مقروض ہوگیا تھا اور قرض خواہوں نے مل کر اسے جیل بھجوادیا ہے۔آپ کو بہت افسوس ہوا۔آپ نے قرض خواہوں کو بلایا اور دس ہزار اپنی گرہ سے ادا کردیئے اور یہ وعدہ لیا کہ وہ نوجوان کو نہیں بتائیں گے کہ قرض کی رقم کس نے ادا کی ہے۔جب نوجوان کو رہا کیا گیا اور بتایا گیا کہ کسی مسافر نے اس کا قرض ادا کردیا ہے تو وہ بڑا حیران ہوا۔جیل سے نکلنے پر اسے معلوم ہوا کہ حضرت عبداللہ بن مبارکؒ شام کی طرف جارہے ہیں اور ابھی چند دن پہلے اپنی اگلی منزل پر روانہ ہوئے ہیں،اس نوجوان کے دل میں ملاقات کا شوق موجزن ہوا،اس نے بھی کوشش کی اور اگلی منزل پر جا پہنچا۔عبداللہ بن مبارکؒ سے ملاقات ہوئی تو آپ نے خوشی خوشی پوچھا: رہائی کیسے ہوئی؟اس نے بتایا کہ کسی نامعلوم آدمی نے اس کا قرض اتار دیا ہے۔آپ نے فرمایا کہ اللہ کا شکر ادا کرو کہ اس نے تمہیں مصیبت سے نجات عطا فرمائی۔عبداللہ بن مبارکؒ کی زندگی میں یہ واقعہ مخفی رہا،جب ان کی وفات ہوئی تو قرض خواہ نے پورا قصہ سنایا،تب لوگ حیران ہوئے کہ ایک عالم باعمل نے کس طرح اپنے شاگرد پر احسان کیا اور کسی کو پتہ بھی نہ چلنے دیا۔

امام محمدؒ کے حالات میں ہے کہ انہوں نے کئی مرتبہ امام شافعیؒ کی مالی امداد کی اور فرمایا کہ اس میں عار محسوس کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔عراق کے زمانہ قیام میں ایک مرتبہ امام شافعیؒ قرض کے سلسلے میں نظر بند کردیے گئے تو امام محمدؒ نے ان کا قرض ادا کر کے انہیں رہا کروایا۔(مناقب کردری:150)

کنز العمال کے مصنف شیخ علی متقیؒ کے بارے میں شیخ عبدالحق محدث داوٗدی لکھتے ہیں کہ وہ طلباء کو اپنے ہاتھ سے بڑی بڑی کتابیں لکھ دیا کرتے تھے،سیاہی خود بناتے تھے اور طلبہ کے لیے قلم وسیاہی کا انتظام اپنے پاس سے کرتے تھے۔

(۵)......استاذ کو چاہیے کہ سبق کا ناغہ نہ کرے،اگر کسی مجبوری کی وجہ سے ناغہ ہوجائے تو دوسرے اوقات میں اس کی تلافی کردے،اگر طالب علم کسی بیماری میں مبتلا ہے تو اس کے لانے کا بندوبست کرے،اگر نہ ہوسکے تو خود جا کر طالب علم کو پڑھانے میں اپنی عظمت سمجھے۔

ربیع بن سلیمانؒ فرمایا کرتے تھے کہ امام شافعیؒ نے مجھ سے کہا کہ اگر یہ طالب علم میرے پاس آکر علم حاصل نہ کرتے تو میں ان کے پاس جا کر ان کو علم پڑھاتا۔

حضرت قاری عبدالحلیم پانی پتی ؒ کے ذمہ بہت سے اسباق تھے، ایک مرتبہ چند طلباء نے سبعہ پڑھنے کی درخواست کی۔ فرمایا: وقت نہیں، مگر تمہارے لیے کوئی صورت نکال لوں گا۔ آپ ظہر کی نماز کے بعد ہدایہ پڑھاتے تھے۔ آپ کے شاگرد مختلف مساجد میں ظہر کی نماز پڑھ کر آتے اور ہدایہ کا درس سنتے تھے۔ آپ نے سبعہ کے لیے ظہر کے بعد اور ہدایہ سے پہلے کا وقت متعین فرمادیا۔ جب سبعہ کا درس شروع ہوا تو آہستہ آہستہ اور بھی طلبہ شامل ہوتے گئے حتیٰ کہ مستقل جماعت بن گئی، کچھ دنوں کے بعد آپ نے فرمایا: وقت کی کمی کی وجہ سے سبق پورا نہیں ہوتا لہٰذا عشاء کے بعد بھی آجایا کرو۔ طلبہ نے سبعہ پڑھنے کے لیے عشاء کے بعد بھی آنا شروع کردیا۔ چار ماہ کے بعد آپ کو خیال ہوا کہ اگر کچھ مزید وقت دے دیا جائے تو رمضان المبارک سے پہلے پوری کتاب مکمل ہوسکتی ہے۔ چنانچہ آپ نے طلبہ کے سامنے یہ تجویز رکھی کہ رات کو میرے مکان پر سوجایا کریں، صبح تہجد کے وقت سے فجر تک کے درمیان سبعہ پڑھائیں گے۔ چنانچہ طلبہ نے عشاء کے بعد آپ کے گھر میں قیام کرنا شروع کردیا اور رمضان المبارک سے پہلے کتاب مکمل ہوگئی۔ طلبہ کے فائدے کو ملحوظ رکھتے ہوئے اپنے اوقات کی قربانی دینے کی یہ عمدہ مثال ہے۔

(۶)...... استاذ کو چاہیے کہ جب تک شاگرد پچھلا سبق یاد نہ کرے وہ اسے اگلا سبق نہ دے۔ طالب علم کی آسانی کی لیے سبق سے متعلق سوالات تحریر کردے اور دوسرے وقت ان کا زبانی جواب پوچھے۔ وقتاً فوقتاً طلبہ سے علمی سوالات پوچھتا رہے تاکہ ان کی معلومات میں اضافہ ہو۔ حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ میں ایک مرتبہ نبی اکرم ﷺ کے پیچھے سواری پر بیٹھا ہوا تھا، آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: معاذ! تم جانتے ہو کہ اللہ تعالیٰ کا بندوں پر کیا حق ہے؟ میں نے عرض کیا: اللہ اور اس کا رسول بہتر جانتے ہیں۔ فرمایا: بندوں کے ذمہ اللہ تعالیٰ کا حق یہ ہے کہ وہ اس کے ساتھ کسی کو شریک نہ کریں۔ پھر پوچھا: بتاؤ اللہ تعالیٰ پر بندوں کا کیا حق ہے؟ میں نے عرض کیا: اللہ اور رسول بہتر جانتے ہیں۔ فرمایا: بندوں کا اللہ تعالیٰ پر حق یہ ہے کہ وہ ان کو عذاب نہ دے۔ میں نے عرض کیا: یارسول اللہ! لوگوں کو اس کی بشارت دے دوں۔ فرمایا: نہیں، بل کہ عمل کرنے دو۔ (مشکوٰۃ) سعید بن میتبؒ نے شاگردوں سے پوچھا وہ کون سی نماز ہے جس کے ہر رکعت کے بعد آدمی التحیات میں بیٹھتا ہے؟ طلبہ نے کہا: معلوم نہیں، فرمایا: مغرب کی نماز کی پہلی رکعت جب فوت ہوجائے تو نماز میں شریک ہونے والے کو ہر رکعت کے بعد التحیات میں بیٹھنا پڑتا ہے۔

(۷)...... اگر استاذ کو یہ معلوم ہوجائے کہ سبق میں کوئی غلطی ہوگئی ہے فوراً رجوع کرلے اور طالب علم سے کہہ دے کہ فلاں بات کرنے میں غلطی ہوگئی ہے۔ صحیح بات یہ ہے کہ اگر طالب علم عبارت کا مفہوم صحیح بتا رہا ہو تو اسے مان لینے میں ہی استاذ کی عظمت ہے، اس طرح استاذ کی توہین نہیں ہوتی بل کہ اس کی امانت اور دیانت کا سکہ طالب علم کے دل پر بیٹھ

جاتا ہے۔ محمد بن کعب قرظیؒ سے مروی ہے کہ ایک آدمی نے حضرت علی رضی اللہ عنہ سے مسئلہ پوچھا: آپ نے بتادیا۔ محفل میں موجود ایک شخص نے کہا: امیر المؤمنین مسئلہ یوں نہیں ہے۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے فرمایا: بے شک مجھ سے غلطی ہوئی۔ (جامع بیان العلم)

سید اسماعیل بلگرامیؒ جب ملا عبدالحکیم سیالکوٹی کے پاس پڑھنے گئے تو ان کے پاس فارغ وقت نہ تھا، لہٰذا انہوں نے ایک جماعت میں شریک کردیا، سید اسماعیل خاموشی سے اسباق سنتے اور کوئی سوال نہ پوچھتے۔ ایک مدت کے بعد ملا صاحب نے پوچھا: تم نے کبھی ایک حرف بھی نہیں پوچھا اس طرح پڑھنے میں کیا فائدہ؟ سید اسماعیلؒ نے کہا: حضرت! خالی وقت ہو تو دریافت کروں، دوسرے طلبہ کے اوقات میں سوال پوچھتے ہوئے ان کے وقت ضائع ہونے کا اندیشہ رہتا ہے۔ ملا صاحب نے فرمایا: بعد نماز عصر آکر سوال پوچھیے۔ سید صاحبؒ نے عصر کے بعد سوال پوچھا تو اس مسئلے پر گفتگو کرتے کرتے مغرب ہوگئی۔ مغرب کے بعد پھر گفتگو شروع کی تو عشاء ہوگئی۔ بعد عشاء ملا صاحب نے فرمایا کہ کل تمام اسباق روک کر یہ مسئلہ سمجھائیں گے۔ لکھا ہے کہ شاگرد استاذ میں متواتر تین دن تک گفتگو ہوتی رہی۔ آخر کار ملا عبدالحکیم نے پوچھا: آخر تمہاری رائے اس مسئلہ میں کیا ہے؟ سید اسماعیل نے نام ظاہر کیے بغیر ایک تحریر پیش کی اور کہا کہ اس مقام میں یہ تحقیق کی گئی ہے، ملا صاحب نے دیکھا تو پسند فرمایا۔

(۸)......اگر استاذ دیکھے کہ طالب علم ذہین ہے تو اسے کند ذہن طلبہ کے ساتھ جماعت کی قید بندی میں نہ رکھے، بل کہ اس کے ذہن اور استعداد کے مطابق اسے پڑھائے تاکہ اس کا وقت ضائع نہ ہو۔ امام محمدؒ کے حالات زندگی میں لکھا ہے کہ دن کا درس تو عام طلبہ کے لیے ہوتا تھا جب کہ رات میں دور دراز سے آنے والے طلبہ کے لیے خاص ہوتا تھا۔

حضرت مولانا عجب نور صاحبؒ نے درسیات کی تعلیم تین سال میں مکمل کی۔ فراغت سے پہلے میر زاہد کا بائیس مرتبہ تکرار کیا۔ قاضی حمد اللہ، شمس بازغہ، میر زاہد، امور عامہ اور تصریح شرح چغمینی جیسی مشکل کتابیں حفظ پڑھاتے تھے، ہدایہ اخیرین اور توضیح تلویح بھی ان کے ہاں عجیب انداز سے ہوتیں۔ ایک طالب علم نے ''میر زاہد امور عامہ'' کے سبق میں کہہ دیا کہ عجیب کتاب لکھی ہے۔ آپ نے فرمایا: اگر مولانا میر زاہد جیسے حالات آج کل کے علماء کو نصیب ہوں تو اس جیسی کئی کتابیں لکھ دیں۔ مولانا عاشق الٰہی صاحب نے چھ ماہ میں ہدایۃ النحو تک پڑھا، ظاہر ہے اگر انہیں جماعت اور نصاب کی قید میں رکھا جاتا تو وقت ضائع ہوتا۔

(۹)......اگر کوئی مضمون طالب علم کو دورانِ سبق سمجھ نہ آرہا ہو تو کسی دوسرے وقت میں سمجھا دے، اگر وہ کسی دوسرے استاذ سے حل کرنا چاہے تو اس میں ناگواری محسوس نہ کرے، بل کہ خود ہی کہہ دے کہ مجھے اتنا ہی پتہ ہے، اگر مزید معلومات کرنی ہو تو بخوبی اجازت ہے، اس کو توہین نہیں سمجھنا چاہیے۔ وہ کون ہے جو یہ دعویٰ کرے کہ مجھے ہر بات معلوم ہے۔

حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: لوگو: جو بات جانتے ہو وہی کہو، جو نہیں جانتے کہو واللہ اعلم (اللہ جانتا ہے) کیوں کہ علم کا خاصہ یہ بھی ہے کہ جو بات نہ جانتا ہو اس میں لاعلمی کا اعتراف کرلے۔ حضرت شعبیؒ سے ایک مسئلہ پوچھا گیا تو فرمایا: مجھے نہیں معلوم۔ یہ سن کر ان کے ایک شاگرد نے کہا کہ آپ نے لاعلمی کا اقرار کر کے ہمیں شرمندہ کردیا۔ فرمایا: ملائکہ مقربین تو اقرار کر کے شرمندہ نہ ہوئے، بل کہ کہا: ﴿سبحانك لا علم لنا إلا ما علمتنا إنك أنت العليم الحكيم﴾ حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے ایک شخص نے کوئی مسئلہ پوچھا، آپ نے فرمایا: میں نہیں جانتا۔ وہ کہنے لگا: عبداللہ بن عمر نے کیا اچھا طریقہ اختیار کیا جو نہیں جانتے اس سے لاعلمی کا اقرار کرلیا۔ حضرت مجاہدؒ سے میراث کا مسئلہ پوچھا گیا، فرمایا: مجھے نہیں معلوم۔ کہا گیا: آپ جواب کیوں نہیں دیتے؟ فرمایا: حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ کا یہی طریقہ تھا جو بات معلوم نہ ہوتی صاف کہہ دیتے کہ مجھے نہیں معلوم۔ حضرت سعید بن جبیر رضی اللہ عنہ سے ایک مسئلہ پوچھا گیا تو فرمایا: مجھے نہیں معلوم اور ہلاکت ہے اس کے لیے جو علم کا دعویٰ کرے۔ مسند عبدالرزاق کی روایت ہے کہ امام مالکؒ نے عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کا قول نقل کیا ہے کہ عالم جب " لا أدري "(میں نہیں جانتا) کہنا بھول جاتا ہے تو ٹھوکریں کھانے لگتا ہے۔ حضرت ابو درداء رضی اللہ عنہ فرمایا کرتے تھے کہ لاعلمی کی صورت میں لا أدري کہنا آدھا علم ہے۔

(۱۰)......استاذ کو چاہیے کہ شاگرد کو فقط الفاظ وحروف کی ہی تعلیم نہ دے بلکہ اخلاق حمیدہ کی بھی تلقین کرے، اگر شاگرد کو کسی ناشائستہ حرکت پر نصیحت کرنا ہو اور وہ حرکت بھی ایسی ہو کہ سب کے سامنے ظاہر کردی جائے تو اسے شرمندگی ہوگی تو چاہیے کہ شاگرد کو تنہائی میں نصیحت کرے، اگر چہ بعد میں شاگرد کا نام لیے بغیر وہ نصیحت سب کو سنا دے، اس طریقہ کار سے اس کو ندامت بھی نہیں ہوگی اور نصیحت سے فائدہ دوسروں کو بھی ہو جائے گا۔

(۱۱)......استاذ کو چاہیے کہ دورانِ سبق بھی خواہ کسی بھی فن کی کتاب ہو طالب علم کے لیے اصلاح کی بات کرتا رہے۔ آج کل اساتذہ کرام اس کا اہتمام نہیں کرتے جس سے عام طور پر طلبہ میں اخلاقی تنزلی آتی جا رہی ہے، اسی لیے بعض طلبہ مسند درس پر بیٹھنے کے باوجود اپنی اصلاح سے غافل ہوتے ہیں، ان کی اس کج روی سے عوام پر غلط اثرات مرتب ہوتے ہیں۔ مہتمم وناظمِ مدرسہ کو اگر کسی طالب علم سے ناراضگی ہو جائے تو اس کا آسان علاج یہ سمجھا جاتا ہے کہ مدرسے سے خارج کردیا جائے، کون دانش مند یہ فیصلہ کرے گا کہ اگر کسی عضو پر پھنسی نکل آئے تو وہ عضو کاٹ دیا جائے، اگر طالب علم سے کبھی کوئی نازیبا بات بھی سنی پڑ جائے تو انا کا مسئلہ نہ بنانا چاہیے، اصلاح کی فکر کرنی چاہیے۔ حضرت شاہ اسماعیل شہیدؒ کو ایک شخص نے مجمع میں حرامی کہا۔ حضرت نے فرمایا: یہ غلط ہے، میرے والدین کے نکاح کے گواہ ابھی موجود ہیں۔ ——— (جاری ہے)

☆......☆......☆